POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 10-11 September 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages 8

HAMARI ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان

اشاعت کا 87 واں سال

Date of Publication: 09-09-2026 • Price: 5/- • 15-21 September 2026 • Issue: 35 • Vol:85

۱۵تا۲۱ر ستمبر ۲۰۲۶ء • شمارہ:۳۵ • جلد:۸۵

پہلی قسط

علی احمد فاطمی کی 'اکبر شناسی'

اسیم کاویانی

اظہارِ عقل میں ہیں احباب گرمِ کوشش
اور مجھ کو فکر یہ ہے؛ اپنا جنوں چھپاؤں
(اکبر)

اکبر الٰہ آبادی مشہور ناقد علی احمد فاطمی صاحب کے اکبر کے سلسلے میں لکھے گئے بارہ مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں اکبر کے فکر و فن پر ترقی پسند اور روایت پسند نقادوں کی مثبت و منفی رایوں کا تجزیہ؛ اکبر کی سوانح اور شاعری پر فاطمی کی تحقیق و تنقید؛ اکبر کی مدح میں پریم چند کے ایک مضمون اور فراق کی ایک نظم کی بازیافت؛ اکبر کے ایک مسدّس 'گنجِ پنہاں' اور اکبر و اقبال کے تعلقات کا جائزہ؛ جیسے موضوعات شامل ہیں۔ یہ مضامین اکبر پر فاطمی کے زبردست اعتقاد کے مظہر ہیں اور ان کا اصرار ہے کہ دوسرے بھی اکبر کے فکر و فن کے صرف معترف ہونے پر اکتفا نہ کریں بلکہ 'معتقد' ہو جائیں۔ یہاں ان کے اسی پیغام کا احتساب کرنا میرا مقصود ہے۔

ہماری زبان میں ایسے بہت سے زود نویس اہلِ قلم موجود ہیں جو مشاہیرِ ادب میں سے کسی کی صدی، سال گرہ یا برسی کے انتظار میں قلم تھامے؛ کمر باندھے ہوئے تیار بیٹھے رہتے ہیں کہ 'جو بھی چلتی ہوئی گاڑی ہو اُسی پر چڑھ جائیں'۔ کسی کے جشن، جلسے، سمینار کی سبیل نکل آئے تو وارے نیارے ہو جائیں۔ بہر حال کچھ جینوئن نقاد ایسے بھی ہیں جو موقعے کی مناسبت سے سنجیدہ فکر کی حامل نگارشات پیش کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ علی احمد فاطمی کا شمار انھی میں ہو۔ فاطمی کبھی ترقی پسند رہ چکے ہیں؛ اب ترقیِ معکوس کی طرف گامزن ہیں۔ ویسے راقم کے استاد شمس کنول نے کبھی کہا تھا کہ 'وہ جوانی بھی کیا جو ایک انسان کو کمیونسٹ نہ بنائے اور وہ بڑھاپا بھی کیا جو اُس کا رُخ مذہب کی طرف نہ پھیر سکے'۔ پھر اکبر الٰہ آبادی، ایک ایسا موضوع ہیں کہ جسے کوئی چاہے تو ملّت کا غم خوار، اسلامی تہذیب و روایات کے ایک خاص عہد کا ترجمان اور مشرقیت کا پاسبان ہیرو بنا دے؛ یا چاہے تو انھیں ترقی و تبدیلی کی راہ میں سنگِ گراں، جدید علوم، سائنس اور ایجادات کا رقیب اور ولن بنا دے؛ وہ دونوں جگہ 'کارآمد' ہیں اور ببانگِ دہل کہہ رہے ہیں:

'چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے'۔ بہر کیف راقمِ تحریر اکبر صدی کے سلسلے میں علی احمد فاطمی کی یہ عجلت لکھی گئی اور 2023 میں طبع ہوئی کتاب 'اکبر الٰہ آبادی' پر اپنا تنقیدی جائزہ آگے بڑھاتا ہے۔

فاطمی صاحب نے اپنی کتاب کے پہلے مضمون 'سوانح اکبر کے چند حقائق: ایک بازدید' میں اکبر کی پیدائش، خاندان، تعلیم، شادی اور ملازمت کے بارے میں مختلف سوانح نگاروں کے بیانات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور اُن کے بیانات میں آئے فروق و تضادات کو بھی معرضِ بحث بنایا ہے۔ شومیِ قسمت سے ان کی کتاب میں نقل چند عبارات میں تحریر یا ٹائپ کی ایسی ایسی لغزشیں در آئی ہیں کہ کئی سلجھے ہوئے اُمور بھی الجھ کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً اکبر کی تاریخِ پیدائش ہی کو لے لیجیے۔ فاطمی صاحب کا مطمحِ نظر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر پر لکھی کتابوں میں نقل در نقل چلا آیا سالِ پیدائش 1846 ہی حتمی مان لیا جائے۔ فاطمی کی کتاب میں اکبر کی پیدائش کے سال کے تعین کے لیے آئے چند حوالے ذیل میں درج کیے گئے ہیں۔ ان میں وہ ٹکڑے خط کشیدہ کر دیے گئے ہیں؛ جو مشکوک، غلط یا خود ساختہ ہیں۔ مغالطہ نہ ہو اس لیے یہاں فاطمی کی کتاب کا صفحہ نمبر مختلف قوسین [ ] میں دیا گیا ہے:

1- '1621ھ بمطابق 16 نومبر 1846 ہفتے کے دن عید کے مہینے میں بہ مقام بارہ پیدا ہوئے۔' ('حیاتِ اکبر': ص:45)[12]

2- 'اکبر کے بھانجے زاہد حسین کے بیٹے بشیر حسین نے اپنے ایک طویل مضمون 'اکبر لائف اور آرٹ'...الخ میں '...براہِ راست 1842 تو نہیں ملتا لیکن ایک جملہ یہ ضرور ملتا ہے:
'حالی 1827 میں پیدا ہوئے۔ اکبر سے نو برس بڑے تھے۔'
(اکبر نمبر علی گڑھ میگزین، ص 67)[12]

3- 'اکبر الٰہ آبادی پر پہلی کتاب طالب الٰہ آبادی کی مانی جاتی ہے... مقدمے کے آخر میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں: 'سید اکبر حسین صاب 16 نومبر 1840 بمطابق شوال مکرم 1261 کو پیدا ہوئے۔' ('اکبر الٰہ آبادی' مولفۂ طالب الہ آبادی، ص:27) یہاں کتابت کی غلطی سے 46 کی جگہ 40 لکھا گیا ہے۔'[13-12]

4- '... پاکستان کے خواجہ محمد زکریا جن کی کتاب 'اکبر الٰہ آبادی: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' معتبر مانی جاتی ہے۔ وہ بھی لکھتے ہیں:
'سید تفضّل حسین کے دو بیٹے ہوئے، بڑے بیٹے اکبر حسین اور چھوٹے بیٹے اکبر حسن۔ اکبر حسین جو اکبر الٰہ آبادی کے نام سے مشہور ہیں 1261ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا سالِ پیدائش بالاتفاق یہی ہے۔' (زکریا، ص11)[13]

بقول فاطمی '... پاکستان میں محمد زکریا اور ہندستان میں عشرت حسین سے لے کر اکبر حیدری تک 1846 ہی مانتے ہیں۔'[14]

قارئینِ کرام، آیئے دیکھیں کہ اصل مصادر میں ان کی واقعی صورت کس طرح کی ہے:

1- '1261ھ ہفتے کے دن عید کے مہینے میں بہ مقام تحصیل بارہ حضرت قبلہ کی ولادت ہوئی۔ 'خورشید عالم' تاریخ نکالی گئی۔ خوب خوشیاں منیں۔' ('حیاتِ اکبر الٰہ آبادی'، ص:46-45)

2- علی گڑھ میگزین کے 'اکبر نمبر' میں اکبر کے بھانجے سیّد بشیر حسین کا مذکورہ مضمون شامل ہے، جس میں حالی کے سالِ پیدائش کی اصل عبارت یوں ہے: 'حالی 1873 میں پیدا ہوئے تھے اور اکبر سے نو برس بڑے تھے۔'

3- فاطمی صاحب نے کسی غلط سلط اڈیشن سے استفادہ کیا ہے۔ طالب الٰہ آبادی کی کتاب 'اکبر الٰہ آبادی' کا قدیم اڈیشن ریختہ پر دستیاب ہے اور اس میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے:
'سید اکبر حسین صاحب 16 نومبر 1840 بمطابق شوال المکرّم 1261ھ کو [موضع بارہ الٰہ آباد میں] پیدا ہوئے۔'
(ص:28)

4- دل چسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد زکریا نے اپنی تلاش و جستجو کا جو نتیجہ ظاہر کیا ہے؛ اسے فاطمی صاحب نے نظر انداز کر دیا۔
'اکبر کی پیدائش جو کہ شوال کے مہینے میں ہوئی اور 1261ھ میں شوال اور اکتوبر کے مہینے تقریباً ساتھ ساتھ چلتے ہیں؛ اس لیے اکتوبر 1845 اکبر کا ماہ و سالِ ولادت ہوا۔ غالباً نومبر 1846 غلط عملِ تقویم کا نتیجہ ہے۔'
(زکریا، ص:13)

زکریا نے یہ بھی لکھا ہے:
'اکبر نے کلیاتِ اکبر کی جلد اوّل میں؛ جو کہ ان کی نگرانی میں شائع ہوئی تھی؛ لکھا تھا: دورِ اول 1862 تا 1875 (سترہ سے تیس سال عمر تک کی غزلیں)۔۔۔ 'اس لحاظ سے

ان کا سالِ پیدائش 1845=17-1852 بنتا ہے۔'

(زکریا،ص:13)

اسی طرح عشرت حسین نے بھی 'حیات اکبرالہ آبادی' میں کہیں بھی 16 نومبر 1846 کا انگریزی سال وتاریخ نہیں لکھی ہے؛ جسے ان کی کتاب میں فاطمی صاحب نے اپنے قلم سے درج کر دیا ہے؛ جب کہ عشرت کے فحوائے تحریر سے 1845 کا سالِ پیدائش ظاہر ہوتا ہے:

'شروع 1859 میں جب رونسٹن نامی مجسٹریٹ نے ایک واقعے کے بعد انھیں ملازمت دی؛ان کی عمر چودہ سال تھی۔'(حیات۔۔۔،ص:30)

اس کے علاوہ فاطمی بھی اقرار کرتے ہیں کہ اکبر نے اپنے ہم عصر شیخ عبدالقادر کو اپنے حالاتِ زندگی کی تفصیل میں تاریخِ پیدائش 1845 فراہم کی تھی اور اکبر کے لوحِ مزار پر بھی 1845 درج ہے۔انھوں نے اپنے مضمون کے آغاز میں یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ 'راقم الحروف تحقیق کے شعبے کا فرد نہیں۔'(فاطمی،ص:11)؛اس کے باوجود انھوں نے قارئین کو اکبر کے سالِ پیدائش کے غلط سلط حوالوں کی طویل بحث میں الجھا کر یہ نتیجۂ تحقیق پیش کرنے کی زحمت کی ہے کہ 'بہر حال تحقیق کی رو سے یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ہے؛اس لیے میں یہ بحث یہیں چھوڑتا ہوں۔'(فاطمی،ص:15)؛ راقمِ تحریر بھی یہ سوچ کر کہ ایک اعترافیہ غیر محقق کے مواد کے پوسٹ مارٹم کی دردسری کیوں مول لے؛ فاطمی کے اس مضمون کی باقی ماندہ تحقیقی موشگافیوں کو یہیں چھوڑ رہا ہے۔

فاطمی صاحب نے 'کہا جاتا ہے کہ' کے حوالے سے اکبر کو 'لسان العصر' کا خطاب دینے کا کریڈٹ شیخ عبدالقادر کو دیا ہے۔(ایضاً:ص:14)۔ راقم کا خیال ہے کہ وہ 'لقب' کہنا چاہتے ہوں گے۔اکبر کا خطاب تو 'خان بہادر' تھا؛ جو انھیں انگریزی سرکار نے دیا تھا۔ویسے صحیح یہ ہے کہ 'لسان العصر' کے موجد ومحرّک میر غلام بھیک نیرنگ تھے۔اُن ہی کی تجویز پر لبیک کہتے ہوئے اڈیٹر 'مخزن' شیخ عبدالقادر، اپنے جریدے میں اکبر کا نام 'لسان العصر' کے لاحقے کے ساتھ شائع کرنے لگے تھے۔اس کا اظہار خود اکبر نے خواجہ حسن نظامی اور کچھ دیگر دوستوں کے نام خطوط میں کیا ہے۔

فاضل نقاد نے خلیق احمد نظامی کی مرتبہ 'ارمغانِ علی گڑھ' میں شامل نظموں کو نشان زد کرتے ہوئے اپنا ایک مضمون 'سرسیّد سے متعلق چند نظمیں: تعارف وتجزیہ' پیش کیا ہے اور ان نظموں کے ذریعے سے اکبر کو ایک طرح سے سرسید دوست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے؛ لکھتے ہیں:

'میں زیادہ ادھر ادھر بھٹکنا نہیں چاہتا، اس لیے کہ مجھے اکبر کی ان چند نظموں پر مختصر باتیں عرض کرنی ہیں جو انھوں نے اپنے حریف پر کہی ہیں اور جس [جن] میں حلیف ہونے کی صدا صاف صاف سنائی دیتی ہے۔'(فاطمی،ص:191)

'اکبر کو سید کا حریف اور مخالف سمجھا جاتا رہا ہے اور یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے لیکن یہ مخالفت نظریاتی تھی، ذاتی نہیں۔'(فاطمی،ص:190)

گویا نظریاتی مخالفت کی کوئی اہمیت نہیں! عام طور پر اور بالخصوص ان دو شخصیتوں کے کردار وعمل کے موازنے میں ان کے افکار ونظریات کے تضاد ہی کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔بھلا ذاتی رنجشوں کو کون اہمیت دیتا ہے۔اکبر کی منتخبہ نظموں میں ایک؛ علی گڑھ کے پرنسپل تھیوڈور بیک کا قطعۂ وفاتیہ ہے۔مسٹر بیک کا 2 ستمبر 1899 کو شملہ میں انتقال ہوا تھا۔

افسوس ہے کہ مر گئے بک [بیک] اب نہیں کوئی
اِس درجہ جس میں علم ہو اِس درجہ حلم ہو
شملے پہ جان دی تو تعجب ہے اس میں کیا
لازم تھی وہ جگہ جو بمقدارِ علم ہو

ایم اے او کالج کے پرنسپل مسٹر بیک انگریزی سرکار کے وفادار ترین اور سخت گیر افسروں میں سے تھے اور کالج کے معاملات میں سرسیّد تک کو اُن سے مخالفت کا یارا نہ تھا۔یہی وجہ ہے کہ یہ مثل مشہور ہوگئی تھی: 'قوم خدا کی، کالج سرسیّد کا اور حکم بیک بہادر کا۔' اکبر نے ایک سرکاری نمک خوار کی حیثیت سے دوسرے سرکاری نمک خوار پر قطعۂ وفاتیہ کہہ دیا۔اس سے بھلا اکبر کی سرسیّد سے حلیفی کا کون سا اشارہ نکلتا ہے! یہی حال فاطمی کے اس لطیفے کا ہے؛ جہاں کالج ہاسٹل کے مہتمم مسٹر ماریسن (Mr.Morrison) کہتے ہیں:

گو کہ شہرت ہے تمھاری دور دور
مجھ سا تم رکھتے نہیں عقل و شعور

اکبر جواب دیتے ہیں:

آپ نے سیکھا ہے اپنے باپ سے
اور مَیں نے جو پڑھا؛ وہ آپ سے

اکبر کی ایک نظم 'مدرسۃ العلوم علی گڑھ' کا تو آغاز ہی منفی انداز سے ہوا ہے:

خدا علی گڑھ کے مدرسے کو؛ تمام امراض سے شفا دے
بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے، امیر زادے، شریف زادے

اور آگے چل کر مدرسے پر طنز کی لَے اس انتہا تک پہنچ گئی ہے:

فریب دے کر نکالے مطلب؛ سکھائے تحقیرِ دین و مذہب
مٹا دے آخر کو وضعِ ملّت؛ نمودِ ذاتی کو گو بڑھا دے

قارئین دیکھ سکتے ہیں کہ فاطمی کی منتخبہ ان تینوں تخلیقات سے اکبر کی سرسیّد سے موافقت کا اتنا تعلق بھی نہیں ہے جتنا کہ کعبے کو بُتوں سے رہا تھا۔سچ پوچھیے تو اکبر کے تقریباً پندرہ ہزار اشعار پر مشتمل کلام میں؛ سیکڑوں اشعار جدید تعلیم اور سرسید کی تحریک کی مذمّت میں موجود ہیں۔ اُن کی صرف دو نظموں کو سرسید کی ستائش میں گنا جاسکتا ہے اور اگر ان نظموں کا پس منظر دھیان میں رکھیں تو ان کا وہ جذبۂ ستائش بھی زیادہ وقیع نہیں ٹھہرتا۔سرسید نے اپنے رفقا کے ساتھ علی گڑھ کالج کی امداد میں اضافے کے لیے حیدرآباد کا دورہ کیا تھا اور امداد کو دوگنا کرا کے لوٹے تھے۔اکبر نے اس کامیاب دورے کا مادۂ تاریخی 'فیاضیِ نظام' نکالا تھا۔ سرسیّد نے انھیں 10 اکتوبر 1891 کو چٹھی لکھ کر فرمائش کی تھی:

'آپ نے مادۂ تاریخ 'فیاضیِ نظام' نکالا ہے جو بے مثل ہے؛اس پر چند مصرعے نہیں؛ چند اشعار لگا دیجیے؛ جس سے کسی قدر حال قوم کی حالت کا اور ضرورتِ تعلیم اور ڈیپوٹیشن کا نظام کے پاس جانے کا بھی ذکر ہو؛ تاکہ اس حال کے معلوم ہونے سے مادۂ تاریخ کی خوبی وعمدگی ظاہر ہو۔'[1]

اور اکبر نے انھیں پندرہ اشعار کا قطعۂ تہنیت لکھ کر بھیج دیا تھا:

سب جانتے ہیں علم سے ہے زندگی کی روح
بے علم ہے اگر تو انساں ہے نا تمام

'ارمغانِ علی گڑھ' میں اس قطعے کے سات اشعار؛ نظم کا سیاق وسباق واضح کیے بِنا؛ 'سرسیّد اور کالج' کی سُرخی کے تحت درج کر دیے گئے ہیں۔انھی اشعار کی جگالی؛ اکبر کی مغربی تعلیم سے محبت ثابت کرنے کے لیے ہمارے اکبر پرست گذشتہ ایک صدی سے کرتے رہے ہیں۔اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ سرسیّد کی فرمایش پر کہے ہوئے یہ اشعار؛ مغربی تعلیم کی مخالفت میں کہے ہوئے اکبر کے سیکڑوں اشعار کے برعکس ہیں اور کون نہیں جانتا کہ فرمایشی کلام عموماً فرمایش کنندہ کے رجحانِ طبیعت اور پسندِ خاطر کو ملحوظ رکھ کر کہہ دیا جاتا ہے۔فاطمی نے بھی اس نظم کے سیاق وسباق اور مکمل متن کے تفحص کی ضرورت نہیں سمجھی اور اسے محض ایک سات اشعار کی مجرد نظم سمجھ کر اِس کی مدح میں چار صفحات سیاہ کیے ہیں۔اکبر کی دوسری تخلیق بہ الفاظِ فاطمی 'چار مصرعوں کی نظم' جو دراصل سرسیّد کی رحلت کے آٹھ برسوں کے بعد؛ اکبر کا کہا ہوا مشہور قطعۂ وفاتیہ ہے۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں؛ سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے، کرنے والے میں

کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

چوں کہ وقت کے ساتھ لوگوں پر سرسیّد کی تعلیمی تحریک کی اہمیت روشن ہوتی جارہی تھی اور وہ ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کرتے جارہے تھے؛اس لیے سرسیّد کی وفات پر:

ع 'مر گیا کول کا بوڑھا؛ چلو یہ پاپ کٹا'

کہنے والے اکبر نے آٹھ برسوں کے بعد اپنے اسی پاپ کی تلافی کے لیے یہ قطعۂ وفاتیہ کہا تھا:

ع 'ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!'

اس قطعے کی بنیاد پر یہ بھرم پھیلایا جاتا رہا ہے کہ سرسیّد کی وفات کے بعد اکبر نے اُن کی مخالفت چھوڑ دی تھی؛ جب کہ انھوں نے سرسیّد اور علی گڑھ کالج کی مخالفت اپنے اخیر دم تک ترک نہیں کی تھی۔سرسیّد کے انتقال کے بائیس برس بعد 1920 میں ایم اے او کالج کو یونی ورسٹی کا درجہ حاصل ہونے پر اکبر نے اسے محاورۂ زبان میں 'قوم کا کام تمام ہونا' بتایا تھا:

ابتدا کی جنابِ سید نے
جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونی ورسٹی پہ ہوئی
قوم کا کام اب تمام ہوا

فاطمی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ 'شمس الرحمٰن فاروقی سے لے کر شمیم حنفی تک سبھی نے آنکھ بند کر کے اور پیٹ بھر کے اکبر کی تعریف کی۔'(ص:168)؛ ظاہر ہے کہ فاطمی کو فاروقی سے بڑھ کر کمک کہاں مل سکتی تھی! انھوں نے اپنے مضمون 'شمس الرحمٰن کی اکبر شناسی' میں اکبر پر ایک زمانے میں لکھے فاروقی مرحوم کے پانچ مضامین کا جائزہ لیتے ہوئے؛ انھیں خوب سراہا ہے۔چوں کہ راقمِ تحریر شمس الرحمٰن فاروقی کے پوری زیرکی کے ساتھ نہ کہ 'آنکھ بند کر کے' لکھے گئے اُن مضامین و خطبات کا مسکت اور تفصیلی جواب اپنی کتاب 'اکبرالہ آبادی: اپنی شکست کی آواز' میں دے چکا ہے اور وہ کتاب اس دور کے کئی پڑھے لکھے نقادوں کو اکبر کے معروضی مطالعے کی طرف منعطف کرنے میں کامیاب رہی ہے؛اس لیے یہاں مزید اظہارِ خیال کو غیر ضروری سمجھتا ہے، لیکن وہ اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شمس الرحمٰن فاروقی اپنے بچپن ہی سے سرسیّد اور اکبر کے تعلق سے ایک موروثی کومپلیس کا شکار تھے؛ جس کا اظہار انھوں نے 2006 میں سرسیّد یادگاری خطبات کی تقریب میں یوں کیا تھا:

چوں کہ ان کے خاندان میں اکبر اور سرسیّد کا موضوع اکثر زیرِ گفتگو رہا کرتا تھا؛اس لیے اُنھیں

☆'بچپن میں عملاً سید احمد خاں اور اکبرالہ آبادی کے متعلق بہت سی معلومات حاصل ہوگئی تھی۔'(فاروقی،ص:3)؛

☆'اکبرالہ آبادی؛ سید احمد خاں کے تعلیمی، دینی اور سیاسی خیالات ونظریات سے قطعاً متفق نہیں تھے اور ان کو اس بات کا یقین تھا کہ سید احمد خاں نے ہندستانی مسلمانوں کی قوم کو بے حساب عقلی اور روحانی نقصان پہنچایا ہے۔'

(فاروقی،ص:4)

فاروقی نے یہ بھی واضح کردیا تھا کہ ☆ان کے والد کے خاندان کا تعلق متشدّد دیوبندی علما کے خاندان سے تھا۔سید احمد خاں کی نام نہاد نیچریت ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔'(فاروقی،ص:5)

('تحقیقِ آثار سے سماجی انقلاب پسندی تک؛ سید احمد خاں اور نوآبادیاتی نظام کا تجزیہ'؛مطبوعہ:2006 مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فاروقی کے مطالعۂ سرسیّد اور اکبر پر اُن کے بچپن کے موروثی عصبیت کے اثرات مستولی رہے تھے۔ (باقی آئندہ)

قسط نمبر:8

مسائلِ لغت وقواعد اور رشید حسن خاں کے فکری ابعاد

ڈاکٹر ابراہیم افسر

گذشتہ سے پیوستہ

رشید حسن خاں نے ترقی اُردو بورڈ، کراچی کے لغت، اُردو لغت (تاریخی اصول پر) کی پہلی جلد (اشاعت 1977) پر ایک جامع تبصرہ کیا۔ ان کا یہ تبصرہ رسالہ 'اظہار' بمبئی کے شمارہ 5، جنوری 1984 میں شائع ہوا۔ بعد میں انھوں نے اس تبصرے کو اپنی کتاب 'تفہیم' میں شامل کیا۔ رشید صاحب نے اس تبصرے کو آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس پر بھی نشر کیا۔ اس تبصرے کے بارے میں انھوں نے اپنے کئی انٹرویوز میں تفصیلی گفتگو کی۔ دراصل ترقی اُردو بورڈ، کراچی نے 1958 کے دوران ایک جامع لغت کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کی تفصیلات رسالہ 'اُردو نامہ' میں شائع ہوتی رہیں۔ اس لغت کا خاکہ 'اوکسفرڈ ڈکشنری' (کلاں) کی طرز پر تیار کیا گیا۔ اس لُغت کی 22 جلدیں 2010 تک منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ اس لغت کی تیاری میں مدیر اعلا کی حیثیت سے مولوی عبدالحق (1960-1961)، ڈاکٹر شوکت سبزواری (1964-1973)، مدیر اوّل ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (1976) اور مولانا نسیم امروہوی (1973 تا حال) نے کلیدی کردار ادا کیا۔ لغت کی پریس کاپی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور مولانا نسیم امروہوی کی اجازت سے (جلد اوّل، ص الف) شائع ہوئی۔ اس لغت کی اشاعت پر رشید صاحب عرصۂ دراز سے نظر بنائے ہوئے تھے۔ انھوں نے مشفق خواجہ کے نام لکھے خط میں اس بات کے واضح اشارے دیے کہ انھیں اُردو لُغت کی پہلی جلد خواجہ صاحب کی معرفت موصول ہوئی۔ مشفق خواجہ کے نام 23 مارچ 1980 کو لکھے خط میں رشید صاحب رقم طراز ہیں:

''اب سے دو برس پہلے بہت جلدی میں، اُردو بورڈ کے لُغت کی پہلی جلد پر چند صفحے لکھے تھے، اب اُن کے چھپنے کی نوبت آئی ہے۔ اگر معلوم ہوتا کہ اِس قدر تاخیر ہوگی، تو ذرا طویل تبصرہ کرتا۔ پھر بھی حصولِ عبرت کے لیے بھی کم نہیں۔ وہ پہلی جلد آپ ہی کی عنایت کی ہوئی تھی (ورنہ مجھے کہاں ملتی)۔ سُنا ہے کئی جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں۔ دیکھیے! کبھی اُدھر کا پھیرا ہوا تو حاصل کروں گا اور ازسرِ نو ایک مفصل تبصرہ لکھوں گا۔ مجرمانہ حد تک بے پروائی اور جہالت کا مال گودام ہے یہ پہلی جلد۔ خیال یہ ہے کہ باقی جلدوں کا احوال بھی ایسا ہی ہوگا۔ پوت کے پانو پالنے ہی میں دیکھ لیے تھے۔ یہ تبصرہ 'اظہار' میں چھپا ہے۔''[67]

مشفق خواجہ نے رشید حسن خاں کے نام 15 اپریل 1977 کو لکھے خط میں ترقی اُردو بورڈ کے قیام کے اغراض ومقاصد، اس کے سربراہان اور اس کی ادبی سرگرمیوں، بالخصوص ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی نصابی کتابوں پر سیر حاصل گفتگو کی۔ انھوں نے اس بارے میں لکھا:

''اُردو بورڈ کی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر تھی۔ اسے جوشؔ صاحب کی فرمایش پر، بہ طور اُن کے ذریعۂ روزگار قائم کیا گیا تھا۔ یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں، جوش صاحب یقیناً بڑے شاعر ہیں اور اُن کا یہ حق ہے کہ اُن کو ذریعۂ روزگار فراہم کیا جائے۔ جوش صاحب کے ایما پر بورڈ میں بعض ایسے لوگوں کو ملازم رکھا گیا جو صرف دربار داری کرنا جانتے تھے۔ انھیں لوگوں نے پہلے تو جوش صاحب کو بورڈ سے نکلوایا اور اَب حقی صاحب کو مجبور کر دیا کہ وہ استعفیٰ دے دیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ بورڈ نے جتنا کام کیا ہے، وہ علمی طور پر ڈاکٹر شوکت سبزواری مرحوم کی کوششوں کا اور عملی طور پر حقی صاحب کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اب لغت پریس جانے ہی والی تھی کہ حقی صاحب اس سے علاحدہ ہوگئے۔ اُن کی جگہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بیک وقت بورڈ کے سیکریٹری اور لغت کے مدیرِ اعلا مقرر ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا لغت سے جو تعلق ہے، وہ آپ کو معلوم ہے۔ موصوف کی بعض نصابی کتابوں میں فرہنگیں بھی شامل ہیں جن میں 'خلا' کے معنی 'آسمان' اور 'سراگائے' کے معنی 'کوڑیاں' لکھے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت اور حقی صاحب نے جو کام کیا تھا، وہ اب ڈاکٹر ابواللیث کے نام سے چھپے گا۔ چلیے کسی کے نام سے چھپے، لیکن دُعا کیجیے کہ کہیں ڈاکٹر صاحب مسودے میں اپنے قلم سے اصلاحیں نہ کر دیں۔ سننے میں آیا ہے کہ لغت کی طباعت شروع ہوگئی ہے۔ پہلی جلد کے تقریباً سو صفحے چھپ گئے ہیں۔ جوں ہی یہ جلد مکمل ہو گی، آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا اور حسب الحکم آئندہ جلدیں بھی، اگر وہ میری زندگی میں چھپ گئیں تو بھیجتا رہوں گا۔ یہ بورڈ 58ء میں بنا تھا۔ اُنیس برس کے بعد پہلی جلد جس میں الف کے الفاظ ہیں، پریس بھیجی گئی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ اُردو میں الف کے بعد بھی بہت سے حروف ہیں۔ مجھے تو شبہ ہے کہ یہ لغت کہیں الف پر ہی ختم نہ ہو جائے۔''[68]

رشید حسن خاں نے ''اُردو لُغت (تاریخی اصول پر) کے بارے میں لکھا کہ اس جلد کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اس کام کو انتہائی بے پروائی اور غیر ذمے داری کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ انھوں نے مدیر اوّل کے ابتدائیے میں شامل غیر ضروری الفاظ کو انشائیہ نگاری سے تعبیر کیا۔ انھوں نے اس لغت کے کارڈ بنانے والوں کے بارے میں لکھا کہ کم سواد کارڈ تیار کرنے والوں کی ساری غلط نگاریاں اور جہالتیں جوں کی توں اِس لُغت میں محفوظ ہوگئی ہیں اور استفادہ کرنے والوں کو ہمیشہ کے لیے گمراہ کرنے کا موثر وسیلہ بن گئی ہیں۔ رشید صاحب کی نظر میں لُغت کے کارڈ بنانے والے نا اہل اور ناتجربے کار تھے جنھوں نے اس لُغت کے پریس میں جانے سے کچھ قبل ہی کارڈوں کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے کارڈ بنانے والوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اور لُغت میں دو طرح کے املا پر سوال قائم کرتے ہوئے لکھا کہ لفظوں کی بیسیوں قطعی غلط صورتوں کو شاملِ لُغت کر کے اس لُغت کو پُھٹارۂ اغلاط بنانے میں اور اُردو املا کو تباہ کرنے میں مرتبین کی بہت مدد کی۔ انھوں نے اس لُغت کے مرتبین پر لفظوں کی غیر حقیقی شکلیں داخل کرنے پر سوالیہ نشان قائم کیے۔ انھوں نے اس لُغت کے نام، زبان و بیان اور لفظوں کے اندراجات کے بارے میں لکھا:

''سرورق پر 'ترقّیِ اُردو بورڈ' لکھا ہوا ہے اور یہ صحیح ہے، لیکن کتاب میں بیش تر 'ترقّی' اُردو بورڈ' ملتا ہے، یعنی مع ہمزہ۔ مثلاً کتاب کے شروع ہی میں پہلی ہی سطر میں 'ترقّی' موجود ہے (ص الف) اور یہ قطعاً غلط املا ہے۔ سرورق پر 'الف مقصورہ' لکھا ہوا ہے، یعنی الف پر جزم لگا ہوا ہے، حالاں کہ اضافت کا زیر ہونا چاہیے تھا (الفِ مقصورہ)۔ زبانوں کی متقابل لُغات (ص ت) اُردو زبان کے لُغات (ص ر)۔

اِس سلسلے میں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ اِس لفظ کی تذکیر و تانیث معرضِ بحث میں رہی ہے۔

اگر زبان اور بیان کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اِس لُغت میں بے شمار غلطیاں ملیں گی۔ مثلاً: ایک کمیٹی تشکیل دی تھی (ص ج)، تصنیف لکھی (ص ن)، مآخذات سے پورا استفادہ کیا ہے (ص ر)، دونوں ماخذات (ص ت) وغیرہ۔ غرض کہ صحّتِ زبان، حُسنِ بیان، صحّتِ املا اور یکسانیِ املا کے لحاظ سے یہ لُغت اغلاط کا پشتارہ ہے۔ مآخذ کے ذیل میں مستند اور غیر مستند کا فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے اور اصل مآخذ سے استفادہ کرنے کے بجائے ثانوی مآخذ سے اسناد نقل کر لینے کی سیکڑوں مثالیں اِس میں ملتی ہیں اور اِس طرح جس چیز کو اعتبار اور استناد کہا جاتا ہے اُس کے لحاظ سے یہ لُغت ناقابلِ اعتنا ہے اور ناقابلِ اعتبار۔ بنیادی کارڈ بنانے والوں کی کم سوادی اور بے پروائی اور اُس کے بعد مرتّبین کی بے نیازی اور ناواقفیّت کے نتیجے میں یہ لُغت غیر معتبر اندراجات کا بہت بڑا مجموعہ بن گیا ہے۔ اِس کے کسی بھی اندراج پر اِس اعتماد کے ساتھ بھروسا نہیں کیا جاسکتا کہ وہ صحیح ہوگا۔ بیش تر اندراجات یا تو غلط ہیں یا ناقص اور ناتمام ہیں یا پھر ایسی تشریحات کا مجموعہ ہیں جن کی افادیت مشکوک ہے۔ سندیں بیش تر مشکوک ہیں اور یہ اِس لُغت کا بدترین پہلو ہے۔

اگر کسی لُغت کے اندراجات سے اعتماد کے ساتھ استفادہ نہ کیا جاسکے اور اُنھیں بلا تکلّف سند میں نہ پیش کیا جاسکے تو پھر اُس لُغت کا حاصل کیا ہوگا؟ اور اگر کوئی لُغت اپنے غلط، غیر معتبر یا ناقص اندراجات کی بنا پر استفادہ کرنے والوں کو گم راہ کرے یا مبتلاے غلط فہمی کرے تو پھر اُس کے متعلّق کیا کہا جائے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اب تک اجتماعی طور پر کوئی ڈھنگ کا کام کرنے کے اہل نہیں ہو سکے ہیں۔ ہم کاغذات پر اچھّی اسکیم بنا سکتے ہیں لیکن اُس کام کو ذمّے داری، ایمان داری اور تعلّقِ خاطر کے ساتھ انجام نہیں دے سکتے ہیں اور یہ لُغت اِس کی سب سے اچھّی مثال ہے۔''[69]

رشید حسن خاں نے اپنے خطوط، انٹرویوز اور مضامین میں اُردو لغت، زبان وقواعد کے بارے میں اپنے فکر ونظر سے قارئین کو متاثر کیا۔ حالاں کہ بعض اہلِ قلم نے ان کے نظریات وافکار سے اختلاف بھی کیا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے لفظ اش اش کو عش عش لکھ کر ان سے ادبی اختلاف کیا۔ (اس بحث کو قارئین راقم الحروف کی مرتبہ کتاب 'اُردو املا: مسائل ومباحث (رشید حسن خاں کے حوالے سے'، ناشر انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2022، ص 441 تا 442 میں پڑھ سکتے ہیں)۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دونوں کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ تا عمر قائم رہا۔ فاروقی صاحب نے رشید صاحب کی کئی کتابوں کی اشاعت میں خوب مدد کی۔ عبداللطیف اعظمی نے بھی اپنے تبصروں میں رشید صاحب کے تجویز کردہ املا اش اش، اعلا وغیرہ سے اختلاف کیا۔ اس کے باوجود ان کے فکری ابعاد کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔

رشید صاحب نے کلاسکی ادب کی فرہنگ اور مصطلحاتِ ٹھگی کو بھی مرتب کیا۔ انھوں نے ان دونوں کتابوں کے بارے میں بھی اپنے ہم نواؤں اور ادبی رفیقوں سے خط وکتابت کی۔ ...(بقیہ صفحہ 6 و 7 پر)

اردو دُنیا

ایم سی ڈی میں اردو مترجمین کی کمی

اردو ایجنڈے کے مستقبل پر تشویش

نئی دہلی۔شمالی، جنوبی اور مشرقی دہلی میونسپل کارپوریشنوں کے انضمام کے بعد 22 مئی 2022 کو تشکیل پانے والی متحدہ دہلی میونسپل کارپوریشن میں اردو زبان کے ساتھ مبینہ ناانصافی کا معاملہ ایک بار پھر شدت سے اٹھایا گیا ہے۔ حال ہی میں ایم سی ڈی جنرل ہاؤس کی میٹنگ میں چوہان بانگر وارڈ کی کونسلر شگفتہ چودھری نے اردو مترجمین کی کمی کا مسئلہ ایوان میں اٹھایا تھا۔انھوں نے کہا کہ وہ اس سلسلے میں میئر اور میونسپل کمشنر کو مکتوب ارسال کریں گی اور پارٹی کی سطح پر بھی اس معاملے کو پوری شدت سے اٹھایا جائے گا۔

شگفتہ چودھری نے خدشہ ظاہر کیا کہ ایک سوچی سمجھی حکمتِ عملی کے تحت ایم سی ڈی میں اردو مترجمین کی بھرتی نہیں کی جارہی ہے۔ان کا کہنا تھا کہ موجودہ حکومت اردو کو ایم سی ڈی سے ختم کرنا چاہتی ہے، تاہم اردو کو کارپوریشن سے ختم کرنے کی کسی بھی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا۔انھوں نے کہا کہ ایم سی ڈی کے کئی کونسلر اردو میں ایجنڈا حاصل کرتے ہیں اور اردو ایجنڈے کی فراہمی ان کا حق ہے۔یاد رہے کہ دہلی میونسپل کارپوریشن ایکٹ 1957 کے تحت میونسپل سکریٹری کے دفتر سے ایجنڈا ہندی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں جاری کیا جانا ضروری ہے۔تینوں میونسپل کارپوریشنوں کے انضمام کے وقت میونسپل سکریٹری کے دفتر میں اردو مترجمین کی چار منظور شدہ پوسٹیں موجود تھیں، لیکن ان میں سے دو پوسٹیں سابق میونسپل سکریٹری بھگوان سنگھ کے دور میں ختم کردی گئیں۔ دوسری جانب اسی کام کے لیے منظور شدہ ہندی مترجمین کی چھے پوسٹیں تا حال برقرار ہیں۔ قابلِ ذکر ہے کہ دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے، اس کے باوجود ایم سی ڈی میں اردو مترجمین کی منظور شدہ پوسٹوں کا ختم ہونا اور خالی اسامیوں پر تقرر نہ ہونا اردو کے مستقبل کے حوالے سے تشویش پیدا کررہا ہے۔

واضح رہے کہ تقریباً تین ماہ قبل سیتارام بازار وارڈ کی کونسلر رافعہ ماہر نے بھی اردو مترجمین کی شدید کمی کا مسئلہ اسٹینڈنگ کمیٹی کے اجلاس میں زور شور سے اٹھایا تھا۔اُس وقت اعلا حکام کی جانب سے انھیں یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ میونسپل سکریٹری دفتر میں ختم کی گئی اردو مترجمین کی دونوں پوسٹیں بحال کی جائیں گی۔اس کے علاوہ ایم سی ڈی کے راج بھاشا و بھاگ میں ہندی، اردو اور پنجابی مترجمین کی جو منظور شدہ پوسٹیں طویل عرصے سے خالی پڑی ہیں اُنھیں بھی پُر کرنے کے لیے کارروائی کی جائے گی۔تاہم متعلقہ سی ای ڈی محکمے کی جانب سے اس سلسلے میں پیش رفت نہ ہونے پر سوال اٹھ رہے ہیں۔صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ایم سی ڈی میں اردو اور ہندی مترجمین کے لیے مقابلہ جاتی امتحان 2009 کے بعد سے ابھی تک منعقد نہیں کیا گیا۔اس وقت پوری دہلی میونسپل کارپوریشن میں صرف ایک مستقل اردو مترجم آفاق حسین خدمات انجام دے رہے ہیں جو رواں سال دسمبر میں سبکدوش ہوجائیں گے۔ایسے میں سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ان کی سبکدوشی کے بعد ایم سی ڈی میں اردو میں ایجنڈا تیار اور جاری کرنے کی ذمے داری کون ادا کرے گا۔ (انقلاب۔دہلی)

انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیرِ اہتمام اردو گھر میں راہی صدی تقریبات کی لکچر سیریز کا آغاز

'کٹرابی آرزو' آج کے دور میں ہندستانی سماج کو سمجھنے کا اہم وسیلہ: سبھاشنی علی

راہی معصوم رضا کی تخلیقات کی اشاعت کا فیصلہ قابلِ تحسین: پروفیسر اختر الواسع

نئی دہلی (31 اگست)۔انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کے زیرِ اہتمام معروف ناول نگار، شاعر اور ادیب راہی معصوم رضا کی صدی تقریبات کے سلسلے میں لکچر سیریز کے پہلے خطبے کا انعقاد اردو گھر کے سیّد ناسیف الدین اوڈیٹوریم میں ہوا۔معروف سماجی کارکن و دانشور سبھاشنی علی نے کلیدی خطاب کیا، جب کہ صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔معروف ادیب و پدم شری پروفیسر اختر الواسع بھی تقریب میں مہمانِ خصوصی کے طور پر موجود تھے۔سبھاشنی علی نے کہا کہ موجودہ دور میں جب آئین پر گرہن کے آثار نظر آرہے ہیں، راہی معصوم رضا کے ناول 'کٹرابی آرزو' کا مطالعہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔اس ناول میں جس انداز سے ہندستانی سماج اور اُس عہد کی حقیقتوں کو پیش کیا گیا ہے اُس سے آج بھی بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔انھوں نے کہا کہ راہی معصوم رضا اعلا درجے کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اعلا معیار کے فکشن نگار بھی تھے۔ان کی ترقی پسند اور کمیونسٹ فکر ان کی تخلیقات میں نمایاں ہے اور وہ اپنے نظریات پر مضبوطی سے قائم رہے۔ان کی تحریروں میں خواتین کے مسائل، غربت، سماجی ناہمواری، تنگ دستی اور تقسیمِ ہند کے اثرات جیسے موضوعات نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ان کے نزدیک 'کٹرابی آرزو' صرف ایک ناول نہیں بلکہ سماج کو سمجھنے کا وسیلہ بھی ہے۔سبھاشنی علی نے کہا کہ راہی نے آمریت اور تاناشاہی کے خلاف بھی اپنی آواز بلند کی۔ایمرجنسی کے دوران انھوں نے اُس وقت کی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کے طرزِ حکمرانی پر سخت تنقید کی۔بہت کم ترقی پسند ادیب ایسے ہیں جنھوں نے اندرا گاندھی کی مخالفت اتنی واضح طور پر کی جتنی راہی معصوم رضا نے کی۔انھوں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے راہی معصوم رضا کی صدی تقریبات کے انعقاد اور ڈاکٹر اطہر فاروقی کی کوششوں سے راہی سے متعلق مضامین کی دوبارہ اشاعت کو سراہتے ہوئے کہا کہ ایسے پروگرام ان کی ادبی میراث کو نئی نسل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کریں گے۔

لکھنؤ سے تشریف لائے پروگرام کے اہم مقرر فرزانہ مہدی نے اپنے خطاب میں کہا کہ راہی معصوم رضا صدی تقریبات کے آغاز کو اب ایک ماہ ہونے کو ہے، اس دوران راہی معصوم رضا کے تعلق سے علمی و ادبی دنیا اور اردو معاشرے میں جو گفتگو ہوئی اور ہورہی ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔یہ بڑی بات ہے کہ اس موضوع پر عالمانہ بحثیں ہوئی ہیں اور یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔اتنی طویل گفتگو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ضرور راہی کی شخصیت اور ان کی تحریروں میں کوئی خاص بات ہے، جو راہی کے بارے میں لوگ زیادہ جاننا چاہتے ہیں اور ان کو زیادہ پڑھنا چاہتے ہیں۔انجمن کا راہی معصوم رضا کی تحریروں پر تنقیدی و تحقیقی کام کرنا اور اس کو اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کرنا بڑی بات ہے، اس کے لیے انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی بلاشبہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔جنوادی لیکھک سنگھ کے ورکنگ صدر پروفیسر سنجیو کمار نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ انجمن راہی کی تحریروں کی درجہ بندی کررہی ہے اور انھیں اردو تدوین کے ضوابط کے ساتھ شائع کرنا اس کے اشاعتی پروگرام کا حصہ ہے۔

پروفیسر اختر الواسع نے صدی تقریبات کے افتتاح پر انجمن ترقی اردو (ہند) کو مبارک باد دیتے ہوئے راہی معصوم رضا کی تخلیقات کی اشاعت کے فیصلے کو قابلِ تحسین قرار دیا۔انھوں نے کہا کہ راہی بنیادی طور پر اردو کے ادیب تھے لیکن ان کی تخلیقات ہندی رسمِ خط میں بھی شائع ہوئیں۔انھوں نے اس پہلو کو قابلِ فخر قرار دیتے ہوئے کہا کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا بلکہ زبان انسانوں کو جوڑنے کا ذریعہ ہے۔راہی معصوم رضا کی ادبی شخصیت اردو اور ہندی کے درمیان موجود اسی تہذیبی اور لسانی ربط کی نمائندگی کرتی ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے صدارتی خطاب میں کہا کہ راہی معصوم رضا ان کے نہایت قریبی تھے اور ان کے بارے میں گفتگو کرنا ان کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔انھوں نے راہی کو ایک غیر معمولی انسان قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ مختلف معاملات میں الجھنے کے باوجود اپنی راہ پر چلتے رہے۔انھوں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی جانب سے راہی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریروں کو دوبارہ منظرِ عام پر لانے کی کوشش کو سراہا۔انھوں نے بتایا کہ صدی تقریبات کے تحت انجمن میں متعدد جلسے اور خطبے منعقد کیے جائیں گے جن میں راہی معصوم رضا کی حیات، فکر اور ادبی خدمات کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا جائے گا۔انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے اظہارِ تشکر پیش کرتے ہوئے کہا کہ صدی تقریبات کا بنیادی مقصد راہی معصوم رضا کی ادبی میراث کو ازسرِ نو اہلِ ادب اور نئی نسل کے سامنے پیش کرنا ہے۔انھوں نے کہا کہ آئندہ بھی راہی کی شخصیت اور فکر کے مختلف پہلوؤں پر علمی و ادبی پروگرام منعقد کیے جائیں گے۔ پروگرام کی نظامت مالک اشتر نے کی۔تقریب میں اہلِ ادب، دانشوروں اور اردو سے وابستہ شخصیات کی کثیر تعداد نے شرکت کی، جن میں گیان چند باگری، سیف محمود، ثاقب صدیقی، جاوید رحمانی اور الیاس سیفی نمایاں تھے۔ (انقلاب۔دہلی)

بابو مہیش نارائن آزاد نظم کے پہلے شاعر تھے: انل سلبھ

پٹنہ سٹی (6 اگست)۔بابو مہیش نارائن ہندی شاعری میں آزاد نظم کے پہلے شاعر، بہار تحریک اور بہار میں ہندی صحافت کے عظیم رہنما تھے۔انھوں نے اخبار 'بہار ٹائمز' شائع کرکے بہار تحریک کی قیادت کی، ان کی موت کے بعد، ان کے ساتھی ڈاکٹر سچیدانند سنہا نے اس تحریک کی کامیابی سے قیادت کی، جس کے نتیجے میں ریاست بہار کی تشکیل ہوئی۔ یہ باتیں پروگرام کے صدر ڈاکٹر انل سلبھ نے 3 اگست کو بروزِ جمعرات شام بہار ہندی ساہتیہ سمیلن میں منعقدہ یوم پیدائش تقریب اور شاعری تقریب کی صدارت کرتے ہوئے کہیں۔عظیم شاعر میتھلی شرن گپت کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ گپت، جنھیں بابائے قوم مہاتما گاندھی نے 'قومی شاعر' کے خطاب سے نوازا تھا، اور حکومتِ ہند کی طرف سے پدم بھوشن سے نوازا گیا تھا، نے نئی تیار شدہ کھڑی بولی کا نام ہندی کے بجائے بھارتی رکھنے کی حمایت کی، ان کا خیال تھا کہ چوں کہ یہ ہندستان کی زبان ہے اس لیے اسے بھارتی کہا جانا چاہیے۔ڈاکٹر سلبھ نے کہا کہ عظیم شاعر رام دیال پانڈے عزتِ نفس، آدرش اور حب الوطنی کا مظہر تھے، وہ ایک عظیم مجاہدِ آزادی، ایک طاقتور خطیب اور قومی جذبات کے لافانی شاعر تھے، وہ ساہتیہ سمیلن کے سب سے بڑے خادموں میں سے تھے۔ وہ چار بار سمیلن کے صدر منتخب ہوئے۔ڈاکٹر سلبھ نے شاعر، صحافی بندیشور پرساد گپتا کو ان کی 72 ویں سالگرہ پر شال اور مالا سے بھی نوازا۔سینئر ادبی شخصیات ڈاکٹر رتنیشور سنگھ، ڈاکٹر ششی بھوشن سنگھ، ڈاکٹر منوج گوردھن پوری، اور شمبھو ناتھ پانڈے نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروگرام کی نظامت شاعر برہمانند پانڈے نے کی اور شکریے کی تجویز کرشنا رنجن سنگھ نے پیش کی۔اس موقعے پر سینئر طنز نگار بانکے بہاری پرساد، پرویر کمار پنکج، وجے کمار سنگھ، گیتا پرساد، سوہنی پریا، موہنی پریا، پریم پرکاش، سومیا کماری، ابھے رام اور دیگر دانشور موجود تھے۔

(پندار۔پٹنہ)

✦✦✦

انجمن ترقی اردو ضلع سہرسہ، سمستی پور اور پورنیہ کمیٹیوں کی تشکیلِ نو

پٹنہ (26 اگست)۔ انجمن ترقی اردو بہار) نے پریس بیان جاری کر کے کہا ہے کہ عبدالقیوم انصاری (سکریٹری انجمن ترقی اردو بہار و سابق چیئرمین بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ) کے ذریعے انجمن ترقی اردو ضلع سہرسہ، سمستی پور اور پورنیہ کمیٹیوں کی تشکیلِ نو کی گئی، جس کی تفصیلات حسبِ ذیل ہیں: **ضلع سہرسہ:** محمد اعظم وارثی (صدر)، محمد سرفراز عالم (نائب صدر)، محمد صابر حسین (نائب صدر)، غلام شبیر فریدی (نائب صدر)، محمد شمس تبریز (سکریٹری)، محمد یوسف جمال (جوائنٹ سکریٹری)، محمد اظہار (جوائنٹ سکریٹری)، ڈاکٹر ابوہریرہ (خازن)، ممبران: محمد انجم حسین، پروفیسر منصور فریدی، کوثر، عبدالستار، عبدالسلام، محمد اسرافیل حق، محمد جعفر پیامی، اختر حسین، محمد نوراللہ رحمانی، حاتم، جمیل آفتاب (مکھیا)، پروفیسر نعمان، محمد ضیاءالدین، حاجی محمد ذاکر حسین، محمد عمران خان اور مقصود عالم۔

ضلع سمستی پور: افتخار احمد ثاقب (صدر)، مولانا ساجد ندوی (نائب صدر)، حافظ ڈاکٹر رونق افروز سلفی (نائب صدر)، مولانا افضل ندوی، (نائب صدر)، پروفیسر قاری محمد شاہد (جنرل سکریٹری)، مولانا نظام الدین ندوی (جوائنٹ سکریٹری)، ماسٹر سرفراز (جوائنٹ سکریٹری)، مولانا شوکت مظاہری (جوائنٹ سکریٹری) ممبران: حافظ خطیب عالم، علاء الدین، عطاء الرحمٰن، توحید انصاری، ماسٹر شاکر خاں، محمد اجمل، ایڈوکیٹ خلیل، تقی، منت اللہ قاسمی، اشرف، حافظ انیس اور آزاد۔ تنویر عالم تنہا (میڈیا انچارج)۔

ضلع پورنیہ: پروفیسر محمد مجاہد حسین (صدر)، منور حسین (نائب صدر)، ڈاکٹر عبدالمنان (نائب صدر)، ڈاکٹر ثاقب انور (نائب صدر)، ناظم اختر (نائب صدر)، ماسٹر سرفراز (نائب صدر)، ڈاکٹر افروز عالم (جوائنٹ سکریٹری)، شہزاد عرشی (جوائنٹ سکریٹری)، ماسٹر ضیاءالدین (جوائنٹ سکریٹری)، عبدالحلیم ثمر ندوی (جوائنٹ سکریٹری)، مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی (جوائنٹ سکریٹری)، اکرم ذکی (خازن)، ممبران: دانش اقبال، شاداب اقبال، شاداب وفا، ظفر امام، احتشام، غلام ربانی، عیاض عالم، محمد نوید انصاری، ماسٹر احتشام، عبدالرزاق، توصیف انور، معصوم اور غلام سرور عالم۔ (روزنامہ 'پندار'۔ پٹنہ)

اردو اساتذہ تنظیم کی اہم نشست، کئی امور پر تبادلۂ خیال

بہار شریف (26 اگست)۔ اردو اور اقلیتی اساتذہ کے مسائل روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ اردو زبان کی تعلیم اور اردو میڈیم اسکولوں کے وجود پر خطرہ منڈلا رہا ہے، لہٰذا پوری اردو آبادی اور اردو طلبہ اور ان کے سرپرست نیز اردو اساتذہ میں غم وغصہ اور بے چینی پائی جا رہی ہے۔ ان مسائل کو لے کر اردو اساتذہ تنظیم نالندہ ہمیشہ سے بیدار رہی ہے اور کوششیں کرتی رہی ہے کہ اردو اسکولوں میں بہتر تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کا بھی فروغ ہو، اسی سلسلے میں اردو اساتذہ تنظیم نالندہ کی ایک اہم اور خصوصی نشست کا انعقاد بمقام بیسک پوائنٹ کلاسز محلّہ چھجوپین پر بہار شریف نالندہ اردو اساتذہ تنظیم نالندہ کی ایک اہم اور خصوصی نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت تنظیم کے صدر جناب تنویر ساکت نے اور نقابت تنظیم کے سکریٹری ڈاکٹر اعجاز احمد نے کی۔ اس نشست میں جن امور پر تبادلۂ خیال کیا گیا جس کے تحت تنظیم کے قیام سے لے کر حال تک کی کارکردگی کا جائزہ لینے، اردو اسکولوں اور اردو اساتذہ کی موجودہ وقت میں درپیش مسائل پر گفتگو اور لائحۂ عمل تیار کرنے، جمعرات کے دن اردو اسکولوں کو ہاف ڈے کرنے کے لیے میمورنڈم دینے، تنظیم کے لیے کمیٹی کی ازسرِنو تشکیل کرنے کے علاوہ دیگر متعلقہ امور جو اہم ہیں اُن پر نشست میں شریک افراد اور اراکین نے تبادلۂ خیال کیا جس کے بعد مندرجہ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں:

* تنظیم کا نام تبدیل کر کے 'نالندہ اردو اینڈ مائناریٹی ٹیچرس ایسوسی ایشن' (Nalanda Urdu Minority Teachers Association) رکھنے کی قرارداد پاس کی گئی۔ کمیٹی کی نئی تشکیل کے لیے ایک دیگر میٹنگ کا انتظار کیا جائے اور اردو کے علاوہ دیگر مضامین کے اقلیتی اساتذہ کو پہلے تنظیم میں شامل کیا جائے تاکہ نئی کمیٹی زیادہ بہتر اور فعال ہو۔ * فی الحال نئی کمیٹی بطور کارگزار کمیٹی کام کرے گی۔ * اردو اسکولوں میں جمعرات کو ہاف ڈے کے لیے تنظیم کی جانب سے ڈی ڈی سی (DDC) نالندہ کی جانب سے ایک میمورنڈم دیے جانے کی قرارداد پاس کی گئی جس کی ایک ایک کاپی ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم اور وزیرِ تعلیم بہار کو بھی دی جائے۔ * تنظیم کے رجسٹریشن کے لیے کاوشیں کی جائیں۔ تنظیم کے لیے فنڈ کی کمی کو دور کرنے کے لیے کوششیں تیز کی جائیں تاکہ مختلف کاموں کے لیے عہدیداران کی جیب پر بوجھ نہ پڑے اور رجسٹریشن کے لیے بھی فنڈ کافی ہو۔ (روزنامہ 'پندار'۔ پٹنہ)

فراقؔ کی شاعری نے اُردو غزل کو نیا آہنگ دیا: پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام دوروزہ قومی سمینار 'فراق گورکھ پوری: شخصیت اور ادبی میراث' اختتام پذیر

نئی دہلی (29 اگست)۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ اہتمام دو روزہ قومی سمینار 'فراق گورکھ پوری: شخصیت اور ادبی میراث' کا اہتمام کیا گیا۔ سمینار کا افتتاح ممتاز اسکالر پروفیسر ہریش ترویدی نے کیا۔ انھوں نے کہا غزل کے فنی تقاضوں پر فراق کی گرفت اتنی گہری تھی کہ میرؔ اور غالبؔ کے رنگِ سخن کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے انھوں نے غزل کو ایک نئی بلند آہنگی بخشی۔ فراق کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کلاسکی سرمایے کو ضائع کیے بغیر جدید انسانی نفسیات اور دکھی روح کی ترجمانی کی، جس نے اردو شاعری کو ایک ایسی آفاقی جہت بخشی جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ فراق نے اردو شاعری کو نیا عاشق دیا ہے۔ فراق کی غزل کے عاشق ومعشوق کی بڑی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں وقار پایا جاتا ہے جو ہماری چار سو سال کی روایت میں نئی چیز ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر خالد علوی نے سمینار میں اپنا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا: فراق نے ہندی اور سنسکرت کا وہ سرمایہ جو بکھرا ہوا تھا اس کو سمیٹ کر اپنی رباعیوں میں پیش کیا اور اس کوشش کو 'رنگوں' کا نام دیا۔ فراق نے جنسیت اور کسی حد تک بوالہوسی کو رمزیت کے ایسے لطیف پردے میں ڈال دیے ہیں کہ جنسیت بھی پاکیزگی کا احساس دلاتی ہے۔ اجلاس کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدائی نے کی۔ انھوں نے کہا فراق کی شاعری نے اردو غزل کو نیا آہنگ دیا۔ وہ اس دور میں شاعری کر رہے تھے جب اقبال کا طوطی بول رہا تھا اور اس زمانے کے شاعر کا اقبال کے اثر سے نکلنا بہت دشوار تھا لیکن اس کوشش میں سب سے زیادہ کامیابی فراق کے ہاتھ آئی۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم نے ایسے لوگوں کو جمع کر لیا ہے جو شاعری اور ادب پر بہت گہری نظر رکھتے ہیں جن سے بجا طور پر یہ امید وابستہ ہے کہ وہ فراق کو نئے تناظر میں پیش کریں گے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا: فراق نے اردو غزل کے کینوس کو وسعت دی اور اس میں ہندی گیتوں کی لے، رتوں، تہواروں اور پوربی تہذیب کے استعاروں کو اس فنکارانہ مہارت سے سمویا کہ زبان کی تاثیر دوچند ہو گئی۔ ان کے یہاں ہجر ووصال کے روایتی موضوعات ایک نئے نفسیاتی اور فکری شعور کے ساتھ ابھرتے ہیں۔

29 اگست 2026 کو سمینار کے دوسرے روز چار تکنیکی اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر شہپر رسول نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا فراق گورکھپوری نے اردو کی شعری روایت میں نئے پہلو وا کیے۔ شاعری میں استعارہ سازی کا عمل شاعر کا امتحانی مرحلہ ہوتا ہے اور فراق کی شاعری میں یہی پہلو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کو نئے استعاروں سے روشناس کیا۔ اس اجلاس میں پروفیسر خالد اشرف نے 'فراق اور پریم چند'، پروفیسر ندیم احمد نے 'فراق اور ٹیگور'، ڈاکٹر عادل حیات نے 'فراق کی نظم نگاری'، ڈاکٹر محمد آدم نے 'فراق کی مکتوب نگاری'، ڈاکٹر سفینہ نے 'فراق کی رباعی گوئی' اور ڈاکٹر عالیہ نے 'فراق کی شاعری کے امتیازات' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ثاقب فریدی نے کی۔ دوسرے اجلاس کی صدارت سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر خالد محمود نے کی۔ صدارتی تقریر کے دوران انھوں نے کہا کہ فراق کو اردو شاعری سے یہ شکوہ تھا کہ اردو میں عربی فارسی تہذیب کے عناصر تو خوب ہیں، لیکن ہندستانی عناصر کی کمی ہے، اس کمی کو انھوں نے ہندستانی عناصر کی شمولیت سے پورا کیا۔ انھوں نے نہایت تخلیقی انداز میں ہندستانی عناصر کو شاعری میں برتا ہے۔ اس اجلاس میں پروفیسر صغیر افراہیم نے 'فراق کی نثر: ان کے مضمون 'غالب پھر دنیا میں' کے خصوصی حوالے سے'، پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے 'فراق بحیثیت تاثراتی نقاد' اور ڈاکٹر عادل حیات نے 'فراق کی نظم نگاری' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر نوشاد منظر نے کی۔ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر جتندر سریواستو نے کی۔ انھوں نے کہا شاعری کا امتیاز یہ نہیں ہے کہ اس پر کتنا زمانہ بیت گیا بلکہ شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ گزرتے ہوئے زمانے کا ساتھ وہ کس طرح دیتا ہے۔ ہمیں آج بھی کبیر کی یاد کیوں آتی ہے۔ شاعر کا اپنے کلچر سے جڑنا کوئی برائی نہیں ہے بلکہ یہ تو شاعری کی خوبی ہے کہ اس میں اصل کلچر کی نمود ہو۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر عبدالعزیز نے 'فراق کی غزل تنقید'، ڈاکٹر نور فاطمہ نے 'اردو کی عشقیہ شاعری اور فراق'، ڈاکٹر سرفراز جاوید نے 'فراق کی غزلوں میں ہندستانی جمالیات' اور ڈاکٹر سیمیں فلک نے 'شمیم حنفی کی فراق شناسی' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر جاوید حسن نے کی۔ چوتھے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدل بسم اللہ نے کی۔ صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ فراق نے اردو اور ہندی شاعری کو متاثر کیا ہے۔ انھوں نے امراؤ جان ادا' کا ہندی ترجمہ کیا اور ان کی شاعری ہندی حلقوں میں بھی خوب مقبول ہوئی۔ اس طرح وہ پوری ہندستانی تہذیب کی علامت بن گئے۔ اس اجلاس میں پروفیسر ارشاد نیازی نے 'فراق کا انداز نقد'، ڈاکٹر معید رشیدی نے 'بیسویں صدی میں غزل کا مقدمہ اور فراق'، ڈاکٹر سلمان فیصل نے 'رباعیات فراق میں ہندستانی عورت' اور جناب امام الدین نے 'باقیات فراق کی ایک جھلک' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت جناب فیصل خان نے کی۔ سمینار کے اختتام پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

اُردو زبان وادب کا پہلا محقق و مدرس

جان بارتھ وِک گل کرسٹ

تالیف وترجمہ

صدیق الرحمٰن قدوائی

قیمت: 250 روپے

مسائلِ لغت وقواعد اور رشید حسن خاں کے فکری ابعاد

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

ان کے خطوط میں ان دونوں کتابوں کی تدوین سے متعلق گفتگو موجود ہے۔ خلیق انجم کی ایما پر انھوں نے کلاسکی ادب کی فرہنگ کو تین جلدوں میں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، لیکن اس کتاب کی پہلی ہی جلد منصۂ شہود پر آسکی۔ باقی دو جلدوں پر خاں صاحب نے کام کرنا شروع کر دیا تھا لیکن موت کے فرشتے نے تمام کاموں پر قدغن لگا دی اور ان کے بہت سے کام التوا میں چلے گئے۔ کلاسکی ادب کی فرہنگ کی پہلی جلد انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی نے شائع کی۔ اس کتاب پر خلیق انجم نے پیش لفظ لکھا اور اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ فرہنگ کلاسکی متن کی فرہنگ نویسی کا اعلا ترین نمونہ ہے۔ ساتھ میں یہ بھی لکھا کہ فرہنگ نویسی کے اس سلسلے میں اس پایے کا عالمانہ اور محققانہ کام اُردو میں پہلی بار ہوا ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی (لاہور) نے لکھا:

''لازم نہیں کہ سب لوگ رشید حسن خاں کی آرا سے اور طریق کار سے سو فی صد متفق ہوں، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کی اُردو املا اپنے موضوع پر سب سے مفصل، جامع اور سیر حاصل کام ہے۔ اسی طرح اصولِ تدوین کی مکمل پابندی کے ساتھ، ان کے مرتب کردہ کلاسکی متون فسانۂ عجائب، باغ و بہار، گلزارِ نسیم، مثنویاتِ شوق، سحر البیان اور زٹل نامہ، ایک اعتبار سے مثالی اور نمونے کی تدوینات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خاں صاحب نے ان میں توقیف نگاری، اعراب نگاری، متن پر حواشی، ضروری تشریحات اور تلفظ و املا کے متعلقات کے ساتھ سب متنوں کے آخر میں فرہنگیں بھی شامل کی ہیں۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے کلاسکی متون مرتب کرنے کی جس روایت کا ڈول ڈالا تھا، اور پھر محمود شیرانی، امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، مالک رام اور بہت سے دوسرے بزرگوں نے تدوینِ متن کی اس روایت کو، بہ لحاظِ معیار و مقدار آگے بڑھایا، خاں صاحب نے اس کی روشنی میں تدوین و تحقیق کا ایک ایسا اعلا معیار پیش کیا ہے کہ اسے مزید اونچے معیار پر لے جانا شاید بہت جلد اور آسانی کے ساتھ ممکن نہیں ہوگا۔ بے شک راقم الحروف کی اس رائے کو کہ 'ممکن ہے خاں صاحب ہی، اُردو تحقیق کے اس شعبے میں خاتم المدونین ثابت ہوں' کو مبالغہ قرار دیا جائے۔''[۲]

رشید صاحب کی مرتبہ کتاب 'مصطلحاتِ ٹھگی' ہندستانی ٹھگوں کی زبان کا بہترین ورثہ ہے۔ یہ کتاب انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں ٹھگوں کی زبان کو سمجھنے میں معاون و مددگار ہے۔ ٹھگ ہندو اور مسلمان دونوں قوموں سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں کی مذہبی رسومات الگ الگ تھیں، لیکن ٹھگی کا کاروبار یکساں تھا۔ ٹھگوں نے اپنے شکار کو پھنسانے کے لیے جو اصطلاحیں وضع کی تھیں وہ دل چسپی کا سامان ہیں۔ اس کتاب کو رشید صاحب نے برسوں کی محنت کے بعد مرتب کیا۔ اصل نسخوں اور مخطوطات کی دستیابی کے لیے انھوں نے لاتعداد خطوط اپنے رفیقوں کے نام روانہ کیے۔ ان کے مداحین نے بھی حقِ دوستی ادا کیا، جہاں بھی کوئی نسخہ یا مخطوطہ انھیں ملتا فوراً رشید صاحب کی خدمت میں روانہ کر دیا جاتا۔ اس قحط الرجال میں اب ایسے ادب نواز اور بے لوث خادم اُردو کہاں ملیں گے؟ موصوف نے اس کتاب کو 'دورِ حاضر کے ادبی ٹھگوں کے نام' معنون کیا۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

''خاں صاحب نے ہماری معلومات کے لیے کتاب کے مقدمے میں بہت ہی عالمانہ انداز میں ٹھگوں کے عقائد، اُن کے طریقِ کار اور اُن کے حالات وغیرہ میں ایسی معلومات فراہم کی ہیں، جن سے عام لوگ بے خبر تھے۔ مثلاً ہم میں سے بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ ٹھگوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے اور دونوں مذہبی فرقوں سے تعلق رکھنے والے یہ ٹھگ کالی دیوی کو حاکم مطلق مانتے تھے۔ اور بہ قول خاں صاحب دل چسپ بات یہ ہے کہ مسلمان ٹھگ خدا اور اُس کے رسول کو ماننے میں اور کالی دیوی کو ماننے میں کوئی تضاد نہیں سمجھتے تھے۔ یوں تو خاں صاحب نے اُردو میں کئی کلاسکی متون مرتب کر کے اعلا درجے کے ادبی کارنامے انجام دیے ہیں، لیکن 'مصطلحاتِ ٹھگی' ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ یہ وہ بھاری پتھر ہے، جسے اُٹھانا خاں صاحب کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ ٹھگوں کی زبان پر تحقیق کر کے لسانی تجزیہ کرنا اور اصل معنوں کا تعین کرنے کے لیے زبان کی غیر معمولی معلومات اور لسانی امور کا بہت اچھا شعور اور تحقیقی نظر درکار ہے۔ خاں صاحب میں یہ تمام صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اُردو میں شاذ و نادر ہی ایسے محقق ہوں گے جو خاں صاحب کی طرح محنت اور دیدہ ریزی کے عادی ہوں۔''[۱]

رشید صاحب نے اپنے خطوط اور انٹرویوز میں اس بات کا ذکر کیا کہ انھیں ابتدا سے ہی علم عروض، لُغت و قواعد اور املا کے موضوعات میں دل چسپی رہی ہے۔ وہ اپنے خردوں اور بزرگوں سے کوئی علمی نکتہ معلوم کرنے میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ وہ ان خشک موضوعات پر تا عمر کمر بستہ رہے اور اپنے زورِ قلم اور وسیع علم سے قارئین کو محظوظ کرتے رہے۔ انھوں نے مشکل کاموں سے کبھی جی نہیں چرایا۔ البتہ اس بات کا خیال کیا کہ ایک ہی موضوع پر دو کام نہیں ہونے چاہئیں۔ اس لیے جب انھیں معلوم ہوا کہ غرائب اللغات کو عارف نوشاہی مرتب کر رہے ہیں تو انھوں نے اپنے کام کو طاقِ نسیاں کے حوالے کر دیا۔

رشید حسن خاں نے لغت نویسوں کی خدمات کو اپنے مضامین میں بھی بیان کیا۔ فرہنگِ آصفیہ کے مولف مولوی سید احمد دہلوی کی لغت نگاری اور ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھوں نے 'مولوی سید احمد دہلوی' مضمون سپردِ قلم کیا۔ اس مضمون میں انھوں نے مولوی صاحب کا قلمی خاکہ کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ ان کی چلتی پھرتی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں سید احمد دہلوی کی لغت نگاری اور دیگر لغت نویسوں کے بارے میں مولوی صاحب کی آرا کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہوئے لکھا:

''ایک تو مولوی صاحب دلّی والے تھے، پھر اُردو کا اُس وقت تک کا سب سے بڑا لُغت مرتّب کر رہے تھے؛ ان دو باتوں نے اُن کی تحریر میں عجیب صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔ لُغت نویسی کی حد تک اُن کا خیال تھا کہ اُنھوں نے اِتنا بڑا کام شروع کیا ہے، تو اب کسی اور کو اس میدان میں قدم رکھنے کی ضرورت نہیں۔ امیر مینائی نے جب امیر اللغات کا ایک جُز چھاپا تو انھوں نے واضح لفظوں میں امیر پر چوری کا الزام لگایا اور کچھ ایسی ہی بات مولّفِ نور اللغات کے متعلق لکھی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ کی پہلی جلد کے مقدّمے میں بہت ہی سخت اور نامناسب الفاظ میں اِن دونوں کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ میں [میں] 'آنکھ' اور 'ہاتھ' وغیرہ کے لیے جو لُغات لکھے تھے، اُنھی کو اِن لوگوں نے اُڑا لیا ہے۔ مولوی صاحب سے کون یہ پوچھ سکتا تھا کہ 'ہاتھ' اور 'آنکھ' کے نئے لُغات یہ لوگ کہاں سے لاتے۔ اصل بات یہ تھی کہ مولوی صاحب امیر مینائی اور صاحبِ نور اللغات کو اہلِ زبان ہی نہیں سمجھتے تھے۔ وہی دہلی اور لکھنؤ کا پُرانا جھگڑا۔''[۲]

اس موقعے پر مدیرِ رسالہ الحمراء حامد علی خاں کے نام لکھا رشید حسن خاں کا خط قارئین کی خدمت میں پیش کرنا لازمی ہے۔ رشید صاحب نے اس خط کو 15 اگست 1961 کو تحریر کیا ہے۔ اس خط میں انھوں نے حامد علی خاں کو مطلع کیا کہ انھوں نے رسالہ الحمراء میں اس سے قبل جو مضمون لکھا تھا اس میں اربابِ لغت سے متعلق مواد شامل تھا، لیکن اس بار جو مضمون آپ کی خدمت میں ارسال کیا جا رہا ہے، اس میں لغات کے حوالے سے تشریحات کو یک جا کر دیا گیا ہے اور اس میں قاموس الاغلاط کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ مکمل خط ملاحظہ کیجیے:

'دہلی-6

15 اگست 61ء

محترمی، تسلیم!

الحمراء کیا بند ہوا کہ رسم پیام و سلام ہی گئی۔ دنوں سے آپ کی خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں۔

اس خط کے ساتھ ہی ایک مقالہ بک پوسٹ آپ کے پاس پہنچے گا۔ میں نے اس موضوع پر سب سے پہلے الحمراء میں لکھا تھا اور آپ نے بے حد ہمت افزائی فرمائی تھی۔ اس تعلق کی بنا پر بے اختیار جی چاہا کہ اسی موضوع سے متعلق یہ مقالہ آپ کی خدمت میں پیش کروں کیوں کہ [آپ] سخن شناس بھی ہیں اور قدر دان بھی۔ آپ محسوس کریں گے کہ اس مقالے میں نقشِ ثانی والی بہت سی باتیں جمع ہوگئی ہیں۔ یہ میرے طویل کام کا تمہیدی حصہ ہے۔ ارادہ یہ ہے کہ اسی کو نمونہ بنا کر تقریباً 5 ہزار الفاظ و محاورات سے متعلق ایسی ہی مفصل تشریحات یک جا کر دی جائیں۔ یہ کسی لُغت کا سنگِ بنیاد نہیں ہے البتہ اربابِ لُغت کے لیے حوالے کا کام دے سکتا ہے۔ یہ صرف توضیحاتی نوٹس کا مجموعہ ہوگا۔ فی الوقت ایک کتاب قاموس الاغلاط کو گفتگو کی بنیاد بنایا ہے، لیکن یہ محض آغاز میں تعیینِ گفتگو یا یقین موضوع کے لیے تھا۔ اب مطلق الفاظ بالترتیب زیرِ بحث آئیں گے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میری اس پریشاں نگاری کو پڑھنے کی زحمت گوارہ فرمائیں اور پھر مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازیں اور میری رہنمائی فرمائیں۔ اس میں جو خامیاں ہوں، ان سے بھی آگاہی بخشیں تاکہ اصل کام بالکل صحیح بنیادوں پر ہو۔ میں نے بعض اور اربابِ نظر سے بھی یہ درخواست کی ہے۔

میں نے اپنے طور اس مضمون کی ترتیب میں خاصی محنت کی ہے اور کوشش کی ہے کہ الفاظ سے متعلق منتشر مباحث، بکھرے ہوئے اقوال اور ضروری تفصیلات کو یک جا کر دیا جائے۔ نیز مختلف لغات میں جو تسامحات ہیں، تلفظ میں جو تغیرات ہوئے ہیں اور وہ درج لغت نہیں ہیں اور جو ضروری باتیں رہ گئی ہیں، ان کو مختصراً واضح کر دیا جائے۔ معلوم نہیں اس میں کامیاب ہوا ہوں یا نہیں۔ میں آپ کے خط کا منتظر ہوں۔''

رشید حسن[۳]

رشید حسن خاں نے غالب کے کلام اور خطوط پر لُغت، زبان و قواعد کے حوالے سے کام کیا ہے۔ انھوں نے غالب پر لکھے اپنے مضامین (مشمولہ رشید حسن خاں کی غالب شناسی، مرتبہ راقم الحروف،

اشاعت 2020) اور کتابوں (انشائے غالب: 1994، املائے غالب: 2000، گنجینۂ معنی کا طلسم: 2017) میں زبان وقواعد کے مسائل پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی، نے 1969 میں غالب صدی کے موقعے پر کلامِ غالب کا اشاریہ تیار کیا تو اس میں رشید صاحب کا نام بھی شامل کیا گیا۔ اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ صدر شعبۂ اُردو خواجہ احمد فاروقی نے ان کا نام کتاب میں زبردستی شامل کیا تھا جب کہ انھیں یہ کام بالکل بھی پسند نہ تھا۔ رشید صاحب نے اشاریۂ دیوانِ غالب پر اپنی عمر عزیز کا طویل حصہ صرف کیا۔ یہ اشاریہ ان کی 45 سالہ تحقیقی وتدوینی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ انھوں نے 'گنجینۂ معنی کا طلسم' پر نوٹس بنانے کا کام دہلی یونیورسٹی میں 1960 میں ملازمت ملنے کے بعد شروع کیا تھا۔ رشید صاحب دیوان غالبؔ کا ایک ایسا اشاریہ مرتب کرنا چاہتے تھے جس میں مرزا غالبؔ کے کلام میں درآئے الفاظ (مفرد اور مرکب) کو یکجا کر کے یہ معلوم کیا جا سکے کہ انھوں نے فلاں لفظ کو کتنی بار مرکب اور فلاں لفظ کو کتنی بار مفرد استعمال کیا ہے۔ رشید صاحب نے دیوان غالبؔ کا کتنی عرق ریزی، گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا ہوگا یا یوں کہہ لیجیے کہ موصوف نے دیوان غالبؔ میں کتنی بار غوطہ زنی اور ورق گردانی کی ہوگی تب جا کر گوہر نایاب 'گنجینۂ معنی کا طلسم' کی شکل میں دیوان غالبؔ کا اشاریہ تیار ہوا۔ رشید صاحب کی دیرینہ خواہش تھی کہ دیوان غالبؔ کی شرح ان کی زندگی میں ہی شائع ہو جائے، لیکن خاں صاحب کا یہ خواب ان کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ موصوف یہ خواہش لیے ہوئے اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کی وفات کے 11 سال بعد غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی اور انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی نے اس اشاریے کو شائع کیا۔ اس بارے میں مزید تفصیلات دیتے ہوئے رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''میرے ذہن میں یہ خیال اُسی وقت بیٹھ گیا تھا کہ یہ کام بھی کرنے کا ہے لیکن دوسرے کاموں نے مہلت نہیں دی۔ اس پر تیس بتیس سال گزر گئے۔ زندگی کی محدود مدت میں سب ضروری کاموں کی تکمیل کون کر سکا ہے؛ یہ سوچ کر اب سے دو سال پہلے میں نے اس کام کا ڈول ڈالا۔ یہ بات عام ہے کہ ایسے کاموں میں بہت سی اُلجھنیں سامنے آتی رہتی ہیں، ایسا ہی ہوا۔ بہ ہر طور، زورقِ اندیشہ بہ ساحل رسید۔''[۶۴]

'گنجینۂ معنی کا طلسم' پر پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''اس اشاریے کا ایک مقصود لفظ شماری بھی ہے۔ اس لیے خاں صاحب نے حاشیے میں ہر لفظ کے متعلق یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ کلامِ غالب میں کُل کتنی بار آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ کتنی بار بہ طورِ مفرد استعمال ہوا ہے اور کتنی بار بہ شکلِ مرکب وارد ہوا ہے۔ مثلاً 'آب' کے تحت حاشیے میں لکھ دیا گیا ہے کہ یہ لفظ کُل باون بار آیا ہے۔ بہ طورِ مفرد نو بار اور بہ طورِ مرکب تینتالیس بار۔ اسی طرح 'اسد' کے تحت انھوں نے شمار کر کے لکھ دیا ہے کہ 268 بار مقطعے میں یہ لفظ بہ طورِ تخلص نظم ہوا ہے پھر وہ تمام مقطعے وہاں نقل کر دیے ہیں۔ رشید حسن خاں نے مقدمۂ کتاب میں یہ وضاحت بھی کی ہے کہ انھوں نے اشعار کے متن کے سلسلے میں نسخۂ عرشی طبع اوّل کو بنیادی ماخذ کی حیثیت سے استعمال کیا ہے، اور جہاں تک نسخۂ عرشی طبع ثانی کا تعلق ہے تو اسے صرف معاون نسخے کے طور پر کام میں لائے ہیں۔''[۶۵]

حواشی:

۶۷ رشید حسن خاں کے خطوط (جلد چہارم)، 2026، ص 341-340

۶۸ مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام، مرتبہ راقم الحروف، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، 2024، ص 368

۶۹ رسالہ اظہار-5، مدیر باقر مہدی، ممبئی، جنوری 1984، ص 52

۷۰ رسالہ بازیافت، پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، جنوری تا جون 2004، ص 295

۷۱ مصطلحاتِ ٹھگی، مرتب رشید حسن خاں، انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دہلی، 2002، ص 10

۷۲ تفہیم، رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2012، ص 136-137

۷۳ مکاتیبِ مشاہیرِ ادب بنام مولانا حامد علی خاں، تحقیق وترتیب زاہد علی خاں، الفیصل، اُردو بازار لاہور، 2001، ص 235-234

۷۴ گنجینۂ معنی کا طلسم، مرتب رشید حسن خاں، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2017، ص 12

۷۵ معیار ومیزان، مرتبہ راقم الحروف، 2024، ص 429

(باقی آئندہ)

☆☆☆

بانو سرتاج: ایک ادھورا خاکہ

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

یہی کیفیت ان کے افسانوں میں بھی نمایاں ہے، جہاں مشرقی تہذیبی قدروں کی بازیافت کی کوشش نظر آتی ہے۔ تحریکِ آزادیِ نسواں کے نام پر مورچہ سنبھالنے والی عورتیں عام طور پر مغرب سے اس قدر متاثر ہوا کرتی ہیں۔ اونچی ایڑی کے سینڈل پہننے کے بعد ان کے قدم مشرقی زمین پر نہیں پڑتے۔ بانو سرتاج اس ترقی کی دوڑ میں پیش پیش ہونے کے باوجود مغرب گزیدہ نہیں رہیں۔ ٹی وی کی خرافات اور عورتوں کی ترقی کے نام پر فحاشی کے سیلاب کو برا سمجھتی ہیں۔ ایک انٹرویو کے دوران انھوں نے بتایا تھا کہ پورن پوری ان کی پسندیدہ ڈش ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے اپنی زمین میں ان کی جڑیں کتنی گہری ہیں۔

بانو سرتاج ہمارے زمانے کی عورتوں کی آزادیِ اظہار کا سمبل بھی ہے۔ گذشتہ دنوں میرے ایک دوست نے مجھ سے پوچھا۔ کیا بانو سرتاج کا تعلق اسی چندر پور ضلع سے ہے جس سے ایک نیا ضلع گڑچرولی بنایا گیا ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو پوچھنے لگے، گڑچرولی اور چندر پور کی کیا چیزیں مشہور ہیں؟ میں نے انھیں بتایا کہ گڑچرولی کے آتنک وادی اور چندر پور کی بانو سرتاج کا آتنک مشہور ہے۔ بانو سرتاج اور آتنک وادی کیا ان دونوں میں کوئی تال میل بھی ہے؟ ان کے استفسار پر میں نے جواب دیا: ان میں تال میل نہ سہی لیکن جب سے انھوں نے اپنا مشہور افسانہ 'پاگل خانہ' لکھا ہے اور نصابی کتاب میں ان کے ایک افسانے کے عنوان پر ردو بدل کے نتیجے میں اس ادارے پر بانو سرتاج نے مقدمہ دائر کیا ہے تب سے لوگ آتنک وادیوں سے اتنا نہیں گھبراتے جتنا بانو سرتاج سے ڈرتے ہیں۔ نہ جانے کب محترمہ کس گھوٹالے کو اپنے کسی افسانہ کے بھانڈے میں بھر کر چوک پر پھوڑ دے۔

پہلی مرتبہ ہم جب چندر پور میں بانو سرتاج کے گھر پہنچے تھے تو ہمیں کئی عجیب وغریب چیزیں دکھائی گئیں۔ ہم آخر تک طے نہ کر پائے کہ ہم لائبریری میں ہیں، کسی میوزیم کی سیر کر رہے ہیں یا گھر میں چل پھر رہے ہیں۔ تقریباً ہر کمرے میں الماریوں پر ان کی کتابیں، مفتوحہ تمغے، تحفے اور ان کے بنائے ہوئے دستکاری کے نمونے سجے ہوئے تھے جنھیں فضول سی چیزوں مثلاً چھلی ہوئی لکڑی کی کترنوں، پھلوں کے خول، بیج، پنسل کے تراشے، سبزیوں وغیرہ کے ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا۔ ان ہی اشیا سے عجیب وغریب گل بوٹے بنے تھے۔ یاد آیا کہ اسی بے معنویت میں معنی کی تلاش ہی ان کے افسانوں کا فن ہے۔ کیپسول کے خول اور مختلف سائز کی دواؤں کی گولیوں سے بنایا گیا ایک شجر کا ماڈل دیکھ کر محسوس ہوا کہ یہی فنکاری ان کے افسانوں میں بھی ہے، جن میں درد بھرے مسائل بھی ہیں اور ان کا درماں بھی۔

بانو سرتاج کا یہ خاکہ ادھورا ہے۔ ہماری آپ کی اور ان کرداروں کی طرح جنھیں بانو سرتاج نے اپنے افسانوں میں بسایا ہے۔ یہ ادھورا پن ہی تو زندگی کی ضمانت ہے۔ زندگی کا یہ سفر جاری ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ خاکہ بھی کبھی نہ کبھی مکمل ہو ہی جائے گا۔

30، گلستان کالونی، نزد پانڈے، امرائی لانس، جعفر نگر، ناگپور-440013
E-mail: zarnigar2005@yahoo.com
Mobile: 9579591149

انجمن ترقی اردو (ہند) کی نئی کتاب

نگارشاتِ سحر

مضامینِ پروفیسر سحر انصاری

تدوین وحواشی: محمد صابر

- پروفیسر سحر انصاری برِّ صغیر ہند وپاک کی ان نابغۂ روزگار شخصیتوں میں سے ہیں جن کے علم کی روشنی نے تقریباً نصف صدی کے عہد کو روشن ومنور رکھا ہے اور ان کے علم وفن کا نہ صرف ایک زمانہ معترف ہے بلکہ اس سے فیضیاب ہونے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہی ہو رہا ہے، لیکن ابھی بھی علم وفن کے متوالوں کا ایک حلقہ ایسا ہے جہاں اس مینارۂ ادب کی روشنی ابھی تک نہیں پہنچ سکی ہے۔
- انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ایسی ہی شخصیتوں کی نادر تحریروں کو اردو ادب کے عام قاری تک اپنے نفیس اور پُرکشش انداز میں پہنچانے کے لیے ہمیشہ سرگرم رہی ہے۔ اس سلسلے کو نہایت منظّم انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے پروفیسر سحر انصاری کی نادرِ روزگار ادبی نگارشات کو شائع کرنے کی جانب عملی قدم اٹھایا گیا ہے۔ اس کتاب کو محمد صابر نے تدوین وحواشی کے ساتھ مرتّب کر کے قارئینِ کرام کے لیے مزید جامع اور کارآمد بنا دیا ہے۔
- بلاشبہ یہ کتاب پروفیسر سحر انصاری کی نادر، بیش بہا اور انتہائی عالمانہ تحریروں کا ایسا مجموعہ ہے جو شائقینِ ادب کے لیے ایک گراں مایہ تحفہ ثابت ہوگی۔

ضخامت: 208 صفحات ـــــ قیمت: 250 روپے

بانو سرتاج: ایک ادھورا خاکہ

محمد اسداللہ

اردو کی معروف افسانہ نگار بانو سرتاج کا یہ خاکہ اس خاکسار کے لیے ایک امتحانی پرچے سے کم نہیں تھا۔ چندر پور میں ان کے اعزاز میں منعقد ہونے والی ایک مجلس میں اسے پڑھنا تھا۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے رکن اور مشہور شاعر مرحوم ڈاکٹر منشاء الرحمٰن منشا نے موصوف پر ایک جھٹ پٹ خاکہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے جان کی امان پائے بغیر ہی انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ میں نے بانو سرتاج کو دیکھا تک نہیں ان پر خاکہ کیا خاک لکھوں۔

اس پر منشا صاحب نے فرمایا: 'یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔'

اس جملے پر میرا ماتھا ٹھنکا کہ کسی کے بارے میں بغیر کچھ جانے لکھ دینا غیر اخلاقی حرکت ہے۔ میرے اس خیال کی تصدیق کرتے ہوئے ایک صاحب نے فرمایا کم از کم ایک آدھ ملاقات تو ضروری ہے۔ اس پر یاد آیا کہ اگر آدھی ملاقات سے کام چل سکتا ہے تو محترمہ سے ہماری آدھی ملاقات رہی ہے۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی کتاب کسی کو بھجوائیں تو اس کی رسید نہیں آتی۔ بارہا یاددہانی کروانے پر جواب آتا ہے۔ 'ہاں بھئی! مل گئی تھی اس میں ایسی کیا خاص بات ہے؟'

مگر جب میں نے اپنی پہلی کتاب، مراٹھی تراجم کا مجموعہ، 'جمالِ ہم نشیں' بانو سرتاج صاحبہ کو بھجوائی تو اِدھر کتاب پہنچی اور اُدھر کھٹ سے جواب حاضر، جو نہ صرف تر و تازہ بلکہ تازہ کیک کی طرح گرم بھی تھا۔ مضمون کیا تھا؛ مشین گن میں کئی سوالات بھر کر داغ دیے گئے تھے۔ 'اس کتاب میں شامل فلاں ڈرامے کے مصنف سے آپ نے ترجمے کی اجازت کہاں لی تھی؟ کب لی تھی؟ اور کیوں لی تھی؟ مفصل تاریخ کے حوالے سے لکھیے۔' میں نے سن رکھا تھا کہ ان کے سرتاج یعنی شوہرِ نامدار سینئر سرکاری وکیل ہیں۔ گویا سیّاں بھئے کوتوال والا معاملہ ہے۔ فوراً اس مراٹھی ڈراما نگار کے اجازت نامے پر درج تاریخ لکھ بھیجی کہ کہیں وہ مجھ پر مقدمہ دائر کر کے مجھے تاریخوں کے چکر میں نہ پھنسا دیں۔

مجھے یاد ہے اس خط میں موصوفہ نے یہ بھی لکھا تھا کہ 'میں آپ کے اس ترجمے سے متفق نہیں ہوں'، اور میرا جواب جو شاید لاجواب تھا: 'محترمہ! یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ میرے ترجمے سے متفق نہیں ہیں کیوں کہ اس سے میں خود بھی متفق نہیں، اور آپ جانتی ہیں آج کل ماں باپ اور اولادوں میں اتفاق نہیں رہا، پھر بے چارہ مترجم تو کسی بھی طرح سوتیلے باپ سے کم نہیں ہوتا۔'

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اس نااتفاقی کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس مراٹھی ڈراما نگار نے محترمہ کو بھی اسی ڈرامے کے ترجمے کی اجازت دے رکھی تھی، مگر میرا ترجمہ پہلے کتابی شکل میں منظرِ عام پر آ گیا۔

افسانہ نگار بانو سرتاج سے اس آدھی ملاقات سے پہلے ہماری ایک پاؤ ملاقات بھی رہی اور وہ ان کی کتابوں کے توسط سے۔ ہمارے ہاں خواتین کے پردے میں رہنے اور انھیں پردے کی اوٹ سے دیکھنے کی روایت اردو شاعری میں بہت پرانی ہے۔ بانو صاحبہ کو ہم نے ان کے افسانوں، مزاحیہ مضامین، ڈراموں اور کالموں کی چلمن سے دیکھا تھا۔

اس زمانے میں ہم بھی انگریزی روزنامہ 'ناگپور ٹائمز' اور ہتواد میں لکھا کرتے تھے اور وہ بھی۔ ان کے انگریزی کالموں پر بھی ان کی شخصیت، ذہنیت، نسوانیت اور افسانویت کی گہری چھاپ تھی۔ ان کے لیٹر ہیڈ پر چھپی ان کی قطار اندر قطار ڈگریاں... ہندی اردو تاریخ میں ایم اے، ایم ایڈ، ڈپلوما اِن گاندھین تھاٹ، ڈپلوما اِن رورل سروسیس، بھاشا سناتک مراٹھی اور پی ایچ. ڈی وغیرہ اتنی ساری ڈگریاں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنی تمام انگلیوں میں رنگ برنگی قیمتی انگوٹھیاں سجائے بیٹھی ہوں۔ مزید یہ کہ ایک کالج آف ایجوکیشن میں استادوں کی استانی ہونا (اور بالآخر پرنسپل ہو کر سبک دوش ہونا) ڈراما نگاری اور ڈراموں میں برسرِ اسٹیج اداکاری کے جوہر، دستکاری میں یدطولیٰ، ہندستان بھر میں چھپنے والے ان کے افسانے اور ان کا دیگر زبانوں میں ترجمے، تنقیدی مضامین، دوسرے ادیبوں کے افسانے وہ اردو میں ترجمہ کریں یہ جدا، ان کا اپنا گھر، سماجی انجمنوں کا بارِ گراں، پہلی مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ ہماری زبان میں استعمال ہونے والی گونا گوں صفات اور مرنجاں مرنج شخصیت کی تراکیب بانو سرتاج ہی کے لیے گھڑی گئی ہیں۔

ترقی کی دوڑ میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کی باتیں ہم نے سن رکھی تھیں۔ بانو سرتاج کے بایوڈاٹا میں ایک ایسی عورت کو چلتے پھرتے دیکھ لیا۔ نہ صرف ان کے کاموں میں مردوں کی طرح دنیا جیت لینے اور چھا جانے کا انداز نمایاں ہے بلکہ ان کے نام میں بھی یہ مردانہ تیور پوری بے باکی کے ساتھ موجود ہیں۔ گویا وہ اپنی سرگرمیوں سے یہ ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہیں کہ وہ زمانہ لد گیا جب بیگم اور بانو مرد کے پیروں کی جوتی ہوا کرتی تھی۔ اب تو بانو سر کا تاج ہے۔ میں نے ایک صاحب سے حیرت کا اظہار کیا کہ یہ صاحبہ افسانے ڈرامے، خاکے، تنقیدی مضامین، مزاحیے طنزیے، بچوں کے لیے، بڑوں کے لیے، اِن کے لیے، اُن کے لیے، آخر کتنا لکھ لیتی ہیں؟ وہ صاحب فرمانے لگے ارے میاں! یہ ایک عورت کا تو کیا کسی مرد کے بھی بس کا روگ نہیں ہے۔ دراصل یہ لکھنے والے دو لوگ ہیں۔

دو لوگ؟ ہم بری طرح چونکے۔ ہاں بھئی ذرا نام پر غور کرو۔ بانو اور سرتاج۔ لفظ سرتاج ہمارے ہاں شوہر کے لیے مجازی معنوں میں استعمال ہوا کرتا ہے۔ عورت خواہ مرد کے اعصاب پر سوار ہو یا تاج بن کر سر پر جگمگائے، لیکن سرتاج کسی عورت کا نام ہو ہی نہیں سکتا۔ ابھی ہماری تہذیب کے اتنے برے دن نہیں آئے کہ ایک عورت دوسری عورت کی سرتاج کہلائے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بانو اور ان کے شوہر یعنی ان کے سرتاج دونوں مل بانٹ کر لکھتے ہیں اور ان دونوں کے نام سے یہ چیزیں چھپتی ہیں اور یہ جوڑی بالکل ایسی ہی ہے جیسے لکشمی کانت پیارے لال وغیرہ۔ ورنہ اپنا گھر بار بال بچے، ملازمت نمٹاتے ہوئے بے تحاشا لکھنا لکھنا، مدام لکھنا، کوئی کھیل نہیں ہے۔ میں نے ان صاحب کی غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے کہا جہاں تک مجھے معلوم ہے، یہ تحریریں جنھیں ادب میں اولادِ معنوی کہا جاتا ہے۔ یہی بانو سرتاج کی حقیقی اولادیں ہیں۔ ان تخلیقات کو انھوں نے ایک ماں کی طرح خونِ جگر دے کر پروان چڑھایا ہے، اسی لیے ان کا دل دماغ، زبان، ان کی سوچ، نسلی اثرات، دکھ سکھ، آرزوئیں امنگیں سب ان کی تحریروں میں ابھر آئی ہیں۔

بانو سرتاج کے افسانے پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے، جیسے ایک تنہا عورت دوسری عورت کی تلاش میں نکلی ہے۔ یہ سفر شاید اپنی تلاش اور شناخت کا ہے۔ ان کی کہانیوں کے عام کردار چھوٹی چھوٹی بچیاں، کم سن لڑکیاں، دوشیزائیں، ساس بہوئیں، بیویاں، مائیں غرض ہندستانی عورت کا ہر روپ ان کے نگارخانے میں موجود ہے۔ عام طور پر عورت کی نظر اپنی ہم جنس کے لباس، اس کے ڈیزائن اور رنگوں سے آگے نہیں جا پاتی۔ عورت کی روح کی گہرائیوں کے ناپنے کے لیے اور حسن کو سمجھنے کے لیے جو نظر درکار ہے وہ تخلیق کار ہی کو میسر آتی ہے۔ بانو سرتاج کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ نفسیات کی انگلی تھامے عام ہندستانی عورت کے دل و دماغ کی سرنگوں میں اترتی چلی گئی ہیں۔

بانو سرتاج کی تصویر دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے گویا وہ ابھی سو کر اٹھی ہیں۔ (بہر حال اٹھ ضرور گئی ہیں) بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے بانو سرتاج نہیں ایک ہندستانی عورت کھڑی ہے جس کی آنکھوں پر مغرب سے ابھرنے والے سورج کی تیز روشنی پڑ رہی ہے (کیا قیامت ہے)، سراسیمگی کی شکار آنکھیں اس چکاچوندھ کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے آس پاس بکھری ہوئی دنیا کا جائزہ لے رہی ہیں۔ ...(بقیہ صفحہ 7 پر)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریک مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران: منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***